میری علمی اور مطالعاتی زندگی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سلسلہ ۳

میری علمی ومطالعاتی زندگی کے زیرِ عنوان پیشِ نظر مضمون میں عالم اسلام کے فرزندِ جلیل داعیٔ کبیر مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ (صدر ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے سوالنامہ کی اس شق کے بارہ میں روشنی ڈالی ہے جس میں شخصیت پر اثر انداز ہونے والی محسن کتابوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا۔ گویا مولانا کے اس پُرمغز اور معلومات آفریں مضمون میں ان کی عمر بھر کے علمی اور مطالعاتی زندگی کا عطر کشید ہو چکا ہے۔ لیجئے مشامِ جان معطر کیجئے۔ مولانا جیسے کثیر الاشغال شخصیت نے ضعف وعلالت کے باوجود اتنی توجہ اور کرم فرمائی؟ یہ سب اس علمی جذب وشوق اور اس دینی درد وسوز کے کرشمے ہیں جسکی شعاعوں اور جس کی حرارت سے منحرف عالم اسلام بلکہ یورپ کے بیشمار مسلمان بھی اپنے دلوں میں ایمان ویقین کا نور اور دعوت وعزیمت کی گرمی محسوس کر رہے ہیں ——— (سمیع الحق)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ آپ اور حضرت مولانا بخیر وعافیت ہوں گے۔ میں اکتوبر کے دو ہفتے ہسپتال رہا۔ رمضان المبارک سے چند دن پیشتر گھر آیا، ہسپتال ہی میں مضمون پر نظرِ ثانی کا کام شروع کر دیا تھا، اب اس کو صاف کروا کر آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ اس میں معتدبہ اضافے ہوئے، خدا کرے آپ پسند کریں۔ بہرحال میں اپنے وعدہ سے سبکدوش ہو گیا۔ اس مضمون کی رسید سے ضرور مطلع کریں۔ جی لگا رہے گا۔

حضرت والد صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام اور درخواست دعا۔

والسلام

مخلص

ابوالحسن علی - ۱۲ رمضان ۱۳۹۱ھ

۱۳۶۴ھ (۱۹۴۵ء) میں رسالہ "الندوہ" کی طرف سے جس کا مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے حکم وتحریک سے تیسری بار اجراء کیا گیا تھا، اور وہ راقم سطور، اور رفیقِ محترم

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سابق استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء (حال ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ مشاہیر اہل علم و اہل فکر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ طلبہ اور اہل ذوق کے فائدے و رہنمائی کے لئے ان کتابوں کا تذکرہ فرمائیں جنہوں نے ان کی ذہنی، علمی، دینی، و اخلاقی تشکیل و تعمیر میں خاص حصہ لیا، ہندوستان کے قدیم و جدید مشاہیر و فضلاء نے اس دلچسپ و مفید بحث و مذاکرہ میں حصہ لیا۔ ان کے مقالات "الندوہ" میں شائع ہوتے رہے، بعد میں "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" کے نام سے یہ مجموعہ شائع ہوگیا۔

بعض احباب کے اصرار سے راقم سطور نے بھی (جس کی عمر اس وقت ۲۳ سال کی کی تھی، اور اسکی علمی و تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔) طلبائے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فائدے اور دلچسپی کے خیال سے اپنے تاثرات و تجربات قلم بند کئے، وہ مضمون اسوقت دارالعلوم کی مجلس علمی میں سنایا گیا، اور ان مضامین کے مجموعہ میں بھی شامل کیا گیا، اب محب گرامی مولانا سمیع الحق صاحب کی خواہش و فرمائش پہ اس پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ اور جا بجا اضافے کردئے گئے ہیں، لیکن جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ تقریباً وہی ہیں جنہوں نے ۲۵-۳۰ سال کی عمر تک متاثر کیا، کہ یہی زمانہ ذہنی نشو و نما اور ارتقاء کا تھا، اس کے بعد جو کتابیں تحقیق و تصنیف اور تدریس کے دوران مطالعہ میں آئیں ان کی تعداد بہت زیادہ اور ان کے متعلق اظہار خیال بہت مشکل ہے۔

مضمون کے مطالعہ کے وقت یہ ملحوظ رہے کہ اس کا طرز واقعاتی اور سوانحی ہے، تنقیدی اور تحقیقی نہیں، اس لئے ذہن پر مطالعہ کے جو اثرات پڑے ان کو بے تکلفی، اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے مصنفین کے خیالات، مسلک اور طرز فکر کی پوری ذمہ داری نہیں لی گئی، اور نہ کسی ایسی کتاب اور مصنف کا ذکر محض اس کے مفید یا بلند پایہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے، جس کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی، یا ذہن و شعور نے اس سے کوئی گہرا اور دیرپا تاثر قبول نہیں کیا، اس لئے اس فہرست میں سے کسی کتاب یا مصنف کے نظر انداز ہو جانے کے معنی اس کی عدم افادیت یا تنقیص نہیں ہے۔

(ابوالحسن علی)

خاکسار کا خاندان ایک خوداں رسیدہ دینی خانوادہ[1] ہے جس کے بزرگوں نے کبھی دخل خزاں میں بھی

---

[1] خاندان حضرت سید احمد شہید، متوطن رائے بریلی (اودھ)

دنیا کو پیام بہار سنایا تھا، ہندوستان میں جب دین کی بہار آخر ہوئی تو اس خاندان پر بھی تنزل آیا، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دین داری بوڑھوں سے زیادہ بڑھیوں میں، اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ نے ۱۹۲۳ء کے شروع میں انتقال کیا، میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، میرے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ لکھنؤ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا، اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کی کتابیں پڑھتا تھا۔ اور لکھنؤ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا ــــــ۔

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و تشفی کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں، اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلامی م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) کی منظوم "فتوح الشام" پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق صاحب کلامی مرحوم حضرۃ سید احمد شہیدؒ کے ہمشیر زادہ منشی سید حمید الدین صاحبؒ کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمٰن صاحب کے نواسے تھے، واقدیؒ کی عربی "فتوح الشام" کو کلامی صاحب نے بڑی قادر الکلامی، اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچیس[1] ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے، چونکہ ان کو اس کا طبعی ذوق تھا، اور جہاد و حرارت ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی، جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرما دیا تھا، اس لئے نظم میں جوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت خالدؓ سے شاعر کو عشق تھا، اور خواب میں بارہا ان کی زیارتیں ہوئی تھیں، اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے۔ وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ سیدہ صالحہ مرحومہ جو قرآن مجید کی بھی حافظ تھیں یہ منظوم "فتوح الشام" بڑے پُراثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں، اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہو گئی تھی، عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لئے آجاتے، اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بارادہ بیٹھ جاتے، اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔

میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف

---

[1] یہ کتاب بڑی تقطیع پر "صمصام الاسلام" کے نام سے مطبع نولکشور، لکھنؤ کی طرف سے شائع ہوئی تھی، بہت سے دیندار خاندانوں میں وہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھی۔

لیکن پُر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں، تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ، حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہؓ بنت الازور اور دوسرے صحابہ کرامؓ، و مجاہدین شام کی جانبازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا، کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا جا ہے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا، اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا، "فتوح الشام" کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق، اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی، خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکے، جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کئے جائیں، پھر وہ نقش جسکو بچپن کے پاک آنسوؤں نے بیداری بخشی ہو —

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوی
فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب کے خلاف (عیسائیوں) جن کے مقدر میں قیامت تک کیلئے اسلام کا عالمگیر حریف و مدمقابل بننا لکھ دیا گیا ہے۔ اور جسکی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے۔ ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا، جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہیں آسکے۔

اس وقت شرفا کے خاندانوں میں "مسدس حالی" کا عام رواج تھا، اس کے اشعار لوگوں کے نوک زبان تھے، تقریروں اور مواعظ میں جا بجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا، مضامین میں نقل کئے جاتے۔ میں نے بھی "مسدس" کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں، اور ان انعامی مضامین میں جو مقابلہ کے لئے لکھے جاتے، بار بار نقل کئے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر "مسدس" کا اچھا خاصہ اثر رہ چکا ہے، عام استعداد و معلومات میں اضافہ کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی مؤرخین و مصنفین کی یہ کوشش بالکل بے اثر رہی، کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خوردبین سے دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی، اور کوہ آتش فشاں پھٹنے کو تھا کہ موقع شناسی سے بروقت اسکو چنگاری دکھا دی گئی، اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی اہمیت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا حالی کے ان پر اثر اور سادے چند بند پر غالب نہ آسکی: جن میں انہوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اسکی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے۔ نہ بعض قوم پرست عربوں کے

مضامین اور تالیفات متاثر کرسکیں جو اپنی قومیت کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے مدافعت کرنے لگتے ہیں، اور اس کے روشن پہلو کے دکھانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

میرے گھر کا ماحول دادا صاحب (مولوی سید فخر الدین صاحب خیالیؔ) اور والد صاحب کی وجہ سے جو جید عالم اور عربی کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے دینی کے ساتھ ادبی بھی تھا، بہت بچپن ہی سے اردو نثر و نظم کی درسی اور غیر درسی کتابیں ہم بھائی بہنوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مولانا حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سی کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں، اس زمانہ میں عام طور پر مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کا اردو نصاب "کمک اردو" "سواد اردو" اور "سفینۂ اردو" رائج تھا۔

ہندوستان کا سررشتہ تعلیم ان کتابوں سے بہتر کتابیں مرتب نہیں کروا سکا، ان میں "سفینۂ اردو" کا اثر آج تک دل و دماغ پر باقی ہے، تقریباً نصف صدی گذر جانے کے بعد، اور ذہنی بلوغ و ارتقاء کے بہت سے منازل طے کر لینے کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آ جائے (جو افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے) تو شاید سب کام چھوڑ کر اسی کو پڑھنے لگوں، اور بچپن کی یاد تازہ کروں، اور کم سے کم اپنی چند پسندیدہ نظمیں اور مضامین مولوی ظفر علی خاں بی۔ اے علیگ کی نظم "رابعہ و سرمست کی کہانی" اور حیدر آباد کے طوفان پر ان کی نظم "او نامراد ندی" سید سجاد حیدر یلدرم کا مضمون "مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ" کو ایک بار پڑھے بغیر ہاتھ سے رکھنا مشکل ہو جائے، اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا، کہ زبان کا لطف اور ذوق زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا، اور تحریر و انشاء میں کبھی مولویانہ خشکی پیدا نہ ہونے پائی، میرے خیال میں ابتدائے عمر میں سلیس و شگفتہ زبان اور اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا، جو سلیس و شیریں زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، ورنہ نئی نسل، اور نئے عہد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور دعوت و تبلیغ کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا، اور جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ قاضی سلیمان صاحب منصور پوری مرحوم کی —— "سیرت رحمۃ للعالمین" کا پہلا حصہ ہے، مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اس کی دونوں جلدوں کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ وی۔ پی رائے بریلی آیا ہے۔ اور اس کے چھڑانے کے لئے اس وقت روپیہ نہ تھا، تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا، اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی، بار بار پڑھی، کئی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا

بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا، اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات حضرت مصعب ابن عمیرؓ کی مکی و مدنی زندگی کا مقابلہ، ان کی والہانہ کیفیت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری، اور حضرات انصار کی مسرت، استقبال اور جان نثاری، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت، آنحضرۃ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات وحالات کا دل پر خاص اثر پڑتا تھا، ٹہل ٹہل کر ان کو پڑھتا تھا، لوگوں کو سناتا تھا، اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں پیدا ہوتی تھیں، قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے، اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے، اس نے سب سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا، جس کے بغیر یہ زندگی خاک اور عالم خس وخاشاک ہے ؎

در خرمن کائنات کردیم نگاہ

یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

انہیں دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی "الفاروق" آگئی، مطبع نامی، کانپور کی چھپی ہوئی، سراپا تصویر پڑھی اور کئی بار پڑھی، عراق کی جنگوں بویب، جسر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ وبرجستہ جملوں میں کھینچی ہے، شاید اس سے زیادہ اثر فردوسی "شاہنامہ" میں مسلسل اشعار اور پرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کر سکا۔ "الفاروق" کے جاندار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر وسناں کا کام کرتے ہیں، مولانا نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے۔ اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی، اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے، لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا، اور اب بھی ہے۔

مولانا کی دوسری کتاب جو اسی دور میں پڑھی، "سفرنامہ روم ومصر وشام" تھی، اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاؤں کے محدود ذخیرۂ کتب میں تھیں، آخرالذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، اور کیا عجب ہے کہ اوّل اوّل اسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا ہو۔ جس کی نوبت برسوں بعد آئی، کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات "الغزالی"، "سوانح مولانا رومؒ" اور "المامون" پڑھی۔ غالباً اسی وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا، کہ سوانح حیات اور غیر ارادی طریقہ پر ان تذکروں اور "تاریخ دعوت وعزیمت" کے سلسلہ میں جو راقم کے قلم سے نکلا، اس کو اختیار کیا گیا، افسوس ہے کہ "شعرالعجم" کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی، جسکو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں، اس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا۔

عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب حسنی مرحوم ایم۔ اے استاد اورنٹیل کالج لاہور کی صحبت اور

اور تذکرہ نگاری کے لئے اس سے بہتر اسلوب اور زبان [illegible]

مجلسوں میں "آبِ حیات" سے تعارف ہوا، سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گیا، جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں، اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔ "گلِ رعنا" گھر کی کتاب تھی اسکو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ، اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئی کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برقؔ لکھنوی لکھنؤ کی ٹکسالی زبان لکھتے اور بولتے تھے، لکھنؤ کے محاورات، اور صحت و صفائی زبان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھے، سخن شناس بھی تھے اور سخن سنج بھی، ابتداء میں شمس لکھنوی کو کلام دکھاتے تھے، پھر آغا تاقب قزلباش لکھنوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے، اور انہیں کے رنگ کی پیروی کی، ان کی صحبت میں زبان کا ذوق، اور اچھے برے کی تمیز پیدا ہوئی، ان کے چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ طبیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا، ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے،

اس سلسلہ میں خاص طور پر مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتشؔ اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے، اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی، اس زمانہ میں اودھ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ کتب تھا، جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی "نیرنگِ خیال" بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر اردو کا ایک مرصع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا۔ بہت دنوں تک "نیرنگِ خیال" اور "آبِ حیات" کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، شررؔ مرحوم، اور رتن ناتھ سرشارؔ کی بھی چند کتابیں پڑھیں، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے، بیکار، و بے اثر نہیں رہتی اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں

پڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب "یادِ ایام" کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ، زبان کا بانکپن بھی موجود ہے، جو میرے علم میں مصنف "گل رعنا" اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا پہلا مضمون جو اب یاد آتا ہے "اندلس" پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے استاد شیخ خلیل بن محمد بن شیخ حسین یمنی (محدث بھوپال) نے ہمیشہ کے لئے دل پر توحید کا نقش قائم کر دینے کے لئے سورۂ زمر بڑی توجہ اور ذوق و شوق سے پڑھائی، عربی ادب ، اور بالخصوص عربی شعر کا عرب صاحب مرحوم کو اللہ نے ایسا فطری ذوق بخشا تھا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ اس قوم کے فرد تھے، جس کے متعلق زبانِ نبوت نے شہادت دی ہے، کہ ایمان اس کے گھر کی دولت ہے، (الایمان یمان) عجم کا "حسن طبیعت" نانی ہال سے اور عرب کا "سوز دروں" انہوں نے دادی ہال سے پایا تھا، قرآن مجید پڑھتے تھے تو خود بھی روتے تھے، اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے، قصائد پڑھتے تھے، تو شوق عکاظ کا نقشہ کھینچ دیتے تھے، توحید ان کا ذوقی مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا، اور دل کو توحید کے لئے کھول دیا، وہ دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ "الا للہ الدین الخالص" (سورہ زمر) کا نقش قائم ہے۔ اور اس کے سامنے "ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ" (زمر) ۔ (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں) کا حیلہ اور دعویٰ، جو ہمیشہ کے نظام شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے، تار عنکبوت معلوم ہوتا ہے؛ ادب میں شیخ خلیل عرب کا ایک مجتہدانہ نصاب تھا، جو ہندوستان میں بالکل نیا تھا، ان کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف منتقل کرنے میں خاص کمال تھا، انہوں نے مبادی صرف اور تحریر و انشاء کی مشق کے ساتھ مصر و بیروت کے سلسلۂ قرأت (ریڈرس) المطالعۃ العربیہ، الطریقۃ المبتکرہ، ۱۵ اجزاء، مدارج القرأۃ ۱۰ جزء کے بعد ابن المقفع کی "کلیلہ و دمنہ"، "مجموعۂ من النظم والنثر" حصۂ نثر کا ایک حصہ حفظاً اور حصۂ نظم، نہج البلاغۃ حصۂ کتب، اور نظم میں حماسہ، اور معری کی سقط الزند، اور دلائل الاعجاز جرجانی بڑے ذوق و جوش سے، نیز مختصر تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ پڑھائی، عربی کے قواعد زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اس گمنام کے نامور ہمنام ابو الحسن علی العزیز کے رسالۂ الفریدی کا ہے، جو چند اوراق کی کتاب ہے، عرب صاحب نے اسکی عملی مشق کرائی، اور یہی مشق اس وقت

تک کام آرہی ہے، اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی، کہ اس میں ایک وقت میں مختلف علوم و فنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی، صرف عربی زبان وادب کی تعلیم تھی اور وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصد حیات اور وہی ذوق طبع۔

عرب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب و منتخب مصنفین، اور ان کے محبوب و منتخب تصنیفات کو اسطرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے، گویا وہی زبان وادب اور طرز ادا کا واحد نمونہ اور ادب و ذوق کا منتہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر حاوی ہو جاتے تھے، اور طالب علم ان کا رنگ اتارنے لگتے تھے، ابن المقفع، اور جاحظ نثر میں، عبد القاہر جرجانی ذوق، نقد ادب اور سخن فہمی میں، متنبی و بحتری شعر میں ان کے منتخب لوگ تھے، اس لئے ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور انداز پیدا ہو جائے، راقم الحروف نے ابن المقفع، اور صاحب نہج البلاغۃ، نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی، اور اس کا بڑا فائدہ ہوا، عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا، کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے، کہ ادب و نثر کا ترکہ صاحب ذوق طلبہ کی میراث ہے، جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انہیں باک نہیں ہونا چاہئے، چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی ان صاحب طرز انشاء پردازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح جڑ کر انعام حاصل کیا،

اس تعلیم کے انتہائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحب طرز نثار سید مصطفےٰ لطفی المنفلوطی کی کتاب "النظرات" عرب صاحب نے دیکھنے کو دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا، اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار رہوار کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی۔

میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ جیسا متبحر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے، یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی، تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے۔ اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی مآخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دوسری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ (بہ قدر استعداد و توفیق) عملی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا، ایک یہ کہ

تعلیم بالکل ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر تھی، مولانا کو مذہب حنفی پر کلیۃً اطمینان تھا، اور وہ اس کے زبردست وکیل و ترجمان تھے، لیکن ان کا درسِ حدیث محدثانہ طرز اور نقدِ حدیث، اصولِ حدیث و رجال کی بحثوں پر مبنی تھا، اور اس میں ہندوستانی طرزِ تدریسِ حدیث سے زیادہ یمنی طرزِ حدیث، اور شوکانی کے طرزِ تالیف کا اثر تھا۔ شوکانی کی تالیف "نیل الاوطار" اس کا ایک نمونہ ہے، محدثین میں خصوصاً ابراہیم الوزیر محمد بن اسماعیل الامیر، اور علامہ مقبلی کی تالیف، اور اصولِ حدیث کے بعض نوادر اُن کے خاص مآخذ تھے، جن میں "تنقیح الانظار" اور "توضیح الافکار" کے قلمی متن و شرح کے مسودات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترکمانی کی "الجوہر النقی" امام زیلعی کی "نصب الرایہ" سے بہت مدد لیتے تھے، اور حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقدِ حدیث کے مسلمہ اصول و مجتہدانہ مباحث سے دیتے تھے، دوسری چیز یہ کہ ان کا درس عملی تھا، جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے، مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکلواتے تھے، اس طرح تدریس و تالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔

درسِ حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نوویؒ کی شرح مسلم سے ہوا، جو ایک مبتدی طالب علم کے لئے بڑا اچھا استاد ہے، شروحِ حدیث کے فائدے اٹھانے اور ذہن پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا، "فتح الباری" سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں ہوئی، اس وقت حافظ ابن حجر کی وسعت نظر، فنِ حدیث پر ان کی قدرت، اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے، جس کی نظیر سے دوسری ملتوں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر "ابوداؤد" کی کتاب الادعیہ اور "ترمذی" کی کتاب "الزہد والرقاق" نے ڈالا۔

اسی زمانہ میں "احیاء العلوم" دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا، اس میں بڑے بھائی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسِ ادب کے لئے ایک فاضل محقق صاحب زبان مراکشی عالم تشریف لائے، یہ علامہ شیخ تقی الدین ہلالی تھے، جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات

زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے، اور عجمیت و ہندیت کے اثر سے کلیتہً آزادی نصیب نہ ہوتی، ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا، تو قرن ثانی و ثالث کی زبان کو مردہ اور صرف کاغذ کے نقش و نگار سمجھتے، اس ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع (عدم تحقیق کی حالت میں بے تکلف لاادری کہہ دینا) مغرب اقصیٰ خصوصاً اہل شنقیط کا حفظ و استحضار، اہل لغت کا اتقان، علمائے نحو کی پختگی، اور اہل زبان کی شیریں نوائی اور خوش گفتاری جمع تھی، بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا، جس کو آدمی جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے، میں نے "اغانی" اور "جاحظ" کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سنا، جو لکھتے تھے، وہی بولتے تھے، اور جو بولتے تھے وہی عربی زبان کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔

ہلالی صاحب سے عربی ادب و شعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت اور مجالس و سفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت و افادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں، ایک تو یہ کہ زبان، اور ادب میں فرق ہے، زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاخ و ایوان اور زبان کی دیوار کے نقش و نگار ہیں۔ ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے، جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے، زبان کی تعلیم و تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے، اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اسکی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے، ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جارہی ہے، جو اکثر اوقات بے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ ہلالی صاحب کہتے تھے کہ "حریری" اور "متنبی" و "حماسہ" ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلاد عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں، اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلاء ان کو پڑھتے ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کل سرمایہ اور جمع خرچ ہیں، ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کیطرح پڑھا جائے، ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ زبان کو انسانی زبان کیطرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہئے، اس پر شیخ نے دار العلوم میں مسلسل تقریریں کیں، اور اپنے مدعا کو دلائل سے ثابت کیا۔

دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ صرف و نحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے، زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف و نحو کے قواعد بے کار ہیں، مفردات،

الفاظ و جمل مکان کی اینٹیں ہیں، اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجینئری کا فن اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجینئرنگ اور اصول تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلالی صاحب سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مستند کتابیں اور عہد عباسی کے ادباء کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں، اس کے لئے انہوں نے ابن قتیبہ کی "الامامۃ والسیاسۃ" ابن المقفع کی "کلیلہ ودمنہ" ابوالفرج الاصبہانی کی کتاب "الاغانی" اور جاحظ کے رسائل کی سفارش کی ——

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا، ادھر ہلالی صاحب کا فیض عام تھا، ادھر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی عربی کا رسالہ "الضیاء" نکال رہے تھے، عربی زبان و تحریر، نقد و تبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا، مصری، شامی، عراقی اور مغربی (الجزائری و مراکشی) رسائل و جرائد تبادلہ میں آتے تھے، پڑھے جاتے تھے۔ اور ان پر گفتگو رہتی تھی، یہ میرے عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا۔ عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے، اور عرب اساتذہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا، اس لئے نہیں کہ ہندوستانی علماء کے بقول (جو سراسر غلط فہمی ہے) یہ کسی جدید عربی میں ہوتے تھے بلکہ طرز ادا، اور اشتقاق کی ناواقفیت کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے، بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اصل تعبیر، اور اظہار خیالی میں جتنی قدرت حاصل ہوئی، ادب و زبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔

مصری و شامی ادباء و فضلاء کے مضامین پڑھ کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر بیٹھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزانہ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سربمہر تھے، وہ اپنے اخبارات و رسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں، اور امیر شکیب ارسلان کے بقول عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا، وہ اس عصر کا عرب ادیب و صحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے، لیکن معنوی و ذہنی حیثیت سے ذوق و دماغ پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا، اور ہمارے ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان کے زیادہ سنجیدہ، زیادہ گہرے اور زیادہ طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول میں نشو و نما پائی تھی، عربوں کے قوم پرست اور وطنی افکار، مغرب سے ذہنی مرعوبیت، اور خیالات کی سطحیت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا، اور ذہن نے اسکی پستی اور کمزوری صاف محسوس کی، ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا، اس حیثیت سے امیر شکیب ارسلان کی تحریروں اور خیالات میں نسبتاً کچھ گہرائی اور پختگی اور اسلامیت معلوم ہوئی لیکن امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص، اور علاج

کی تجویز میں اس وقت جس شخص کے خیالات وافکار میں نسبتاً زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی، اور جسکی فراست نے متاثر کیا وہ سید عبد الرحمٰن الکواکبی کی تخیلی کتاب "ام القریٰ" ہے، جواب پرانی ہو چکی ہے، اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جارہے ہیں، لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ وہ قومیت عربیہ کے اولین نقیبوں میں ہیں، اور انہوں نے سب سے پہلے دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں میں بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی، دل پھیکا ہو گیا، اور عقیدت میں کمی آئی۔

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں رسالہ توحید امرتسر میں جو مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا "تیرھویں صدی کا مجدد اعظم" کے عنوان سے حضرت سید احمد شہید کے متعلق مولوی محی الدین قصوری مرحوم کا ایک سلسلۂ مضمون شائع ہوا، ہلالی صاحب کے کہنے سے ۱۹۲۹ء۔۱۹۳۰ء میں میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو ہلالی صاحب کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے "المنار" میں بھی شائع کیا، اور ترجمۃ السید الامام احمد بن عرفان کے نام سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی چھاپ دیا، اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا، اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیم کی "زاد المعاد" میرا کتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی، دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے، اگر مجھے کبھی پورے ذخیرۂ علمی سے محروم کر دیا جائے، اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے، تو میں کتاب اللہ اور زاد المعاد اپنے ساتھ رکھونگا، اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے، اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتۂ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سب سے زیادہ موثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب قیام اللیل ہے، اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں، بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رخ بدل دیتی ہے، اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے مؤثر واقعات لکھے ہیں، اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پر اثر تفسیر، اور قیام لیل کے فضائل جمع کئے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں، اور اپنا اثر کر جائیں، تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس پر آشوب زمانہ میں دستگیری کی، یہ اور حافظ ابن قیمؒ کی "الجواب الکافی" نوجوانی میں بہترین نگران اور اتالیق، اور اخلاقی محتسب و ناصح ہیں، زمانہ تعلیم کے بے شعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور معلمین سے نفع اٹھانے اور ان کے احترام اور

طالب علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا، وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب تعلیم المتعلم ہے، اسی طرح تحصیل علم میں علوئے ہمت، عزیمت اور ذوقِ علم پیدا کرنے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی کتاب "علمائے سلف" نے مہمیز کا کام دیا، اور دل و دماغ پر علمائے سلف کی عظمت وعزیمت کا نقش ثبت ہوگیا، میرے نزدیک ہر سچے طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اسکو حرزِ جان بنا کر رکھنا چاہیئے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تصنیفات کو الٹتے پلٹتے ان کا ایک مسودہ "ارمغانِ احباب"[1] کے نام سے ہاتھ آگیا، جو انہوں نے اپنی ۲۶ سال کی عمر میں لکھا ہے، اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفروں کا روزنامچہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف لیکن اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردانِ خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوئی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے اصل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا، جہاں والد مرحوم حضرت سیدنا لکھتے ہیں وہاں دل جھوم جاتا تھا۔ اور دل ایک خاص کیفیت محسوس کرتا تھا ——

دوسری چیز جس نے حضرات اہل اللہ کی محبت وعقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علیؒ بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ ارشاد رحمانی ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے کچھ حالات، حکایات وملفوظات اور سلوک وطریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادیؒ میرے والد مرحوم کے شیخ تھے، اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکر خیر سنا تھا۔ اس روحانی تعلق اور ذہنی ربط سے کتاب ذوق وشوق سے پڑھی، محبت کے اشعار، اور عاشقانہ کلمات دل میں چبھ گئے، اور تیر ونشتر کی طرح دل میں اتر گئے، اس سے کچھ پیشتر یا بعد والد مرحوم کا ایک مختصر سا رسالہ یا مقالہ جو "استفادہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، بار بار پڑھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے گنج مراد آباد کی حاضری کے حالات، اور وہاں کے مشاہدات، اور مولانا کے الطاف وعنایات کے واقعات قلم بند کئے تھے، اس نے مولانا کی محبت وعقیدت، اور اہل اللہ سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ وبزرگان دین کے ملفوظات کے مجموعے بھی نظر سے گزرے، ان مجموعوں میں

---

[1] یہ سفر نامہ پہلے رسالہ "معارف" اعظم گڑھ میں بالاقساط شائع ہوا۔ پھر انجمن ترقی اردو دہلی، اور مکتبہ ندوۃ العلماء کی طرف سے "دہلی اور اس کے اطراف" کے نام سے شائع ہوا۔

حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات "فوائد الفواد" اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علیؒ کے ملفوظات "درالمعارف" کا قلب پر اثر پڑا، اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی، لیکن قلب نے واقعات، اور بے ساختہ گفتگو اور خلوص کی گرمی ونرمی محسوس کی۔

فلسفۂ تصوف اور فلسفۂ اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں، کبھی متاثر نہیں کیا، البتہ درد و محبت، اور سوز و گداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں، اور یہ تیر کم خطا جاتے تھے، درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے ؎

ہم نے اپنے آشیانہ کیلئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

بزرگوں کی مجالس و ملفوظات کے سلسلہ میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ عرصہ کے بعد جب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اور ان کی التفات و عنایات سے سرفراز ہوا، تو ان کی زبان سے دینی حقائق و نکات، اور سلوک و تصوف کی نادر تحقیقات سن کر عالم حیرت میں پڑ گیا، اللہ تعالیٰ نے نے ان کے ملفوظات و مجالس کے قلم بند کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی[1] اپنے علم و فہم کے مطابق یہ کہنے میں ذرا مبالغہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرصۂ دراز سے تزکیہ و احسان، اور دینی حقائق کے سلسلہ میں ایسے بیش قیمت ملفوظات، اور ایسے گہرے علوم و مضامین سننے میں نہیں آئے ؎

والغیب عند اللہ

وفوق کل ذی علم علیم

طالب علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا۔ اور دو کتب خانے دیکھے، ایک زندہ و متکلم، ایک جامد و خاموش، زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب[2]، اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ، شاہ صاحب کے واسطہ سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب، اور ابن عبد الہادی وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جا کر "احیاء العلوم" مع تخریج عراقی "فضل علم السلف علی الخلف"، "دقائق الکنوز"، "تلبیس ابلیس"، "مختصر منہاج القاصدین" وغیرہ منگوائیں۔ "تلبیس ابلیس" کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی ——

---

[1] یہ مجالس مکتبۃ الفرقان، لکھنؤ کی طرف سے "صحبتے با اہل دل" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اور اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ [2] آپ حضرت شاہ پیر محمد صاحب سلونی چشتی نظامی کی اولاد میں سے تھے، زندگی گمنامی میں بسر کرنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریس حدیث کی خدمت قبول فرمائی اور کئی سال وہاں شیخ الحدیث رہنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن و مؤثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ کے بغیر ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں، جنہوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابل ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصاب تعلیم کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب و شیخ تقی الدین الہلالی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشو و نما کیا، ندوۃ العلماء کا تخیل، اور دین و دنیا کی ہم آمیزی، اور علماء و اہل دین کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے اس خطبۂ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ ہوا، جو موصوف نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پڑھا تھا، اور میں نے اسکو غور سے بعد میں چھپا ہوا پڑھا، پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور اطمینان بڑھتا رہا، اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی عقائد و نظریات کا جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب مرحوم بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی، جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اسکی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔

یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے "سچ" اور "صدق" کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" (مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیکی کی "تاریخ اخلاق یورپ" (مترجمہ مولانا عبد الماجد صاحب۔ دریابادی) نے بڑی مدد دی، اور اس سے بڑا مواد ملا جس سے اپنے مضامین و استدلال میں بہت کام لیا، مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کے مضامین ترجمان القرآن اور ان کی کتاب "تنقیحات" نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی، مولانا ابو الاعلیٰ کے "ترجمان القرآن" کے مضامین نے طرز استدلال اور طرز تحریر پر بھی اثر ڈالا، اور ان کی تحریروں نے ذوق و فکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی و اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پُر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب (ISLAM AT THE CROSS ROADS) معلوم ہوئی، جس کا لفظ لفظ

دل نشین ہوا، عرصۂ دراز کے بعد ان کی دوسری فکر انگیز لیکن دلچسپ کتاب (ROAD TO MECCA) شائع ہوئی، جس کا عربی ترجمہ "الطریق الی مکۃ" انہوں نے ازراہ عنایت مجھے خود بھیجا، یہ اس اجمال کی تفصیل، اور اس نظریہ کی عملی تطبیق تھی، جو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں پیش کیا تھا، میں نے ان کی اجازت سے اسکا ترجمہ اور تلخیص "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ہر جویائے حق، اور صاحب ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

۳۹-۱۹۳۸ء میں مصر کے فاضل مؤلف ڈاکٹر احمد امین کی "فجر الاسلام" جلد ۱ اور ضحی الاسلام جلد ۳ کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ عہد نبوی اور عہد اموی وعباسی کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی وعلمی تاریخ ہے، جس میں واقعات سے نتائج اخذ کئے ہیں جزئیات سے کلیات قائم کئے ہیں اور ہر دور اور حیات انسانی کے ان مختلف شعبوں پر مجموعی نگاہ ڈالی ہے، کتاب مصنف کی قوت ملاحظہ، اور حسن استنتاج کا اچھا نمونہ ہے۔ اور اگرچہ موجودہ عصری ومغربی تاثرات سے کلیۃً پاک نہیں، اور اس کے مطالعہ سے ذخیرۂ حدیث پر اعتماد کی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے اور اسکی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہیے، مگر میری سادہ لوحی کہیے، یا ناقدانہ نظر کی کمی کہ مجھے مصنف کی اس کمزوری کا پورا احساس اس وقت نہیں ہونے پایا اس کا صحیح احساس وعلم اور اس سے اذیت اس وقت ہوئی جب میں نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی فاضلانہ کتاب "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" پڑھی۔ جس کے مطالعہ کی سفارش فن حدیث کے ہر طالب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین سے خیالات میں بڑا توارد معلوم ہوا، کئی جگہ حواشی پر اختلاف یا اظہار خیال کیا، یا مصنف کو بے اختیار داد دی، لیکن سب سے زیادہ فائدہ جو ان کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا، وہ شگفتہ، شیریں اور علمی طرز تحریر کا ہے، جس میں احمد امین اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کے تذکرہ سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی عمومی عظمت دل ودماغ پر قائم ہوئی، تذکرہ اور الہلال کے ادبی سحر حلال نے مسحور کیا۔ "ترجمان القرآن" کی دوسری جلد سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے گوشے سامنے آئے، اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی، سورۂ یوسف پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال، بلکہ ادب عالی کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔

جب ترجمۂ قرآن اور تفسیر کی تدریس کی خدمت دار العلوم میں سپرد ہوئی، تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حواشی کی قدر آئی، جن میں انہوں نے

مفسرین کے اقوال کا عطر اور ان کی تحقیق کا وہ حصہ نقل کر دیا ہے، جس کو اس زمانہ کا سلیم ذہن آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ اس میں مولانا کی سلامتِ فکر، حسن انتخاب، اور تحریر کی شگفتگی بخوبی عیاں ہے۔ میں نے دیوبند کی ایک ملاقات میں مولانا سے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، مولانا کو بڑی مسرت ہوئی، اور بعض صاحبوں سے اسکو نقل کیا،

جدید معلومات و تحقیقات نے تفسیر کے سلسلہ میں جو نئے سوالات پیدا کر دئے ہیں ان کا حل تلاش کرنے میں، اور قرآنی اعجاز کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں "تفسیر ماجدی" اور اس کے مصنف مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تفسیری مضامین و تحقیقات سے بڑی مدد ملی۔ اور اپنے مطالعہ و معلومات میں تحقیقی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ کی تمام تصنیفات نقد کامل عیار، اور علم و انشار کے لحاظ سے معیار ہیں، لیکن اس بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ "خطباتِ مدراس" ہے، اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے، تو اسکو زندہ جاوید بنا دے اور اگر مقبول ہو، (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے) تو مغفرت کے لئے تنہا کافی ہے، بار بار مزے لے لے کر پڑھی، حدیث و سیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے، اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث و سیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

مولانا سید مناظر احسنؒ گیلانی کی کتابوں میں بڑے معلومات اور مواد ہے، بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرز تحریر، اور بات سے بات نکالنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ ان کی کتابوں میں جی لگا۔ اور اپنے علم میں اضافہ ہوا خاص طور پر ان کی کتاب "النبی الخاتم" سیرت پر بڑی البیلی کتاب ہے، اسی طرح ان کی دوسری کتاب "ہمارا قدیم نظام تعلیم و تربیت" بڑی پر از معلومات اور مؤثر کتاب ہے، تیسری کتاب "تدوین حدیث" بڑی مبصرانہ، اور نکتہ ورانہ تصنیف ہے، ان کا مضمون "مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" بھی بڑی بصیرت و معلومات کا ذریعہ بنا، اور اس سے ان کے دوسرے مقالے جو "الفرقان" "شاہ ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا تھا، تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آئے۔

"حیات جاوید" "وقار حیات" اور "تہذیب الاخلاق" کے پرانے فائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی و سیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جسکی تکمیل "حیات شبلی" سے ہوئی، مولوی سید طفیل احمد صاحب کی "حکومت خود اختیاری" اور "مسلمانوں کا روشن مستقبل" سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ ہوئی، ہندوستان کی اسلامی، دینی و علمی تاریخ کا سب سے

بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا، کبھی خیال نہیں آیا تھا، حیدرآباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی، تو والد مرحوم کی تصنیف اور سرمایۂ حیات "نزہۃ الخواطر" کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں، ان کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جیتی جاگتی تاریخ آنکھوں کے سامنے آگئی، علماء و مشائخ اہل درس و اہل تصنیف، اہل ذوق و اہل کمال سلاطین و وزراء امراء و روساء کے ایسے حالات اور ہندوستان کی علمی تاریخ کے ایسے قیمتی نوادر و نکات معلومات میں مل گئے۔ جن کے لئے سینکڑوں کتابیں الٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے بھی کام نہ چلتا۔ یہ ایک بہت بڑی ثقافت اور معلومات کا خزانہ تھا، جس کو ہندوستان کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو نظر انداز نہیں کر سکتا، اور جس کے بغیر آدمی اپنے ملک ہی میں اندھیرے میں رہیگا، علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا استفادہ نہیں کیا، اور مضامین و تحریروں میں کسی سے اتنا کام نہیں لیا جتنا "نزہۃ الخواطر" کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کے تاریخی معلومات سے جن کی تلاش کے لئے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت، اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہیے، اور کس جگہ سے وہ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میری محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد سے کوئی استفادہ نہ کر سکا، لیکن اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ ایسا علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں، کہ ساری عمر اس سے استفادہ کا موقعہ ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا، جتنا علامہ اقبالؒ کے کلام کا، غالباً اسکی وجہ یہ ہے، کہ وہ ان خیالات و تمناؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست ہو چکی ہیں۔ اقبال اور ان کے کلام پر اردو میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو شاید کسی معاصر شخصیت اور اس کے فکر پر شائع نہیں ہوئی، لیکن ان میں سب سے زیادہ پُرمغز اور روح پرور کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "روح اقبال" معلوم ہوئی ——

علامہ مرحوم سے ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء میں دوسری ملاقات کی، اور کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ میں "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" کے عنوان سے شائع ہوا، بلاد عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی، اور ناشناسی پر دل کھول کھول کر رہتا، اور ٹیگور کی قدرافزائی پر غصہ آتا، علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کے لئے ایک مفصل و طویل

مضمون علامہ مرحوم کی زندگی وخصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالم عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق "روائع اقبال"[1] کے ذریعہ ہوئی، جس نے بلاد عربیہ کے نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی، ابتدائی استغراق و انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں۔ اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے، اور جسکو جو کچھ ملا ہے، اسی سے ملا ہے۔

لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں، اور عالم اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اب بھی اسکو طاقت وخود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ـــ "مذہب وعقلیات" پر نظر پڑی جو "بقامت کہتر اور بقیمت بہتر" کی صحیح مصداق ہے، ذوق وذہن نے اسکو پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل ونقل کے حدود اور تجربہ وعلم انسانی کی نارسی، اور کوتاہی وناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا۔ جو مطالعہ میں بہت کام آیا، اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ، اور اسکی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا، پڑھا مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا "ان ھم الا فی یخرصون" ـــ اور "بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه ولما یاتهم تاویله" کی تفسیر وتوضیح ہوتی رہی، حافظ ابن تیمیہ کی سورۂ اخلاص" اور "کتاب النبوات" کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو پختہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلم ومربی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی مرحوم، جن کی اصابت رائے، خداداد سلامت فکر، استقامت، اور گہرا علم زندگی کی ہر منزل، اور ہر موڑ پر میرا دستگیر رہا، برابر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی "ازالۃ الخفاء" کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے، لیکن نوعمری کی سطحیت اور کم سنی کی عجلت کی وجہ سے کبھی دو چار صفحے سے زیادہ نہ پڑھ سکا، دفتر اول کا پہلا مکتوب جو حضرت نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کو لکھا ہے، اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہ سلوک کے تجربات لکھے ہیں، ہمیشہ ہمت شکن ثابت ہوا، اور جسطرح بدشوق بچے ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ

۱۔ حال میں اس کا ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں کے قلم سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے "نقوش اقبال" کے نام سے شائع کیا ہے۔

پڑھ کر چھوڑ دیا کرتے ہیں میں بھی اس مکتوب کے چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا، لیکن ایک بار اس کا عزم کر لیا کہ مکتوبات کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا، چاہے بڑا حصہ سمجھ میں نہ آئے، چنانچہ اس کے چاروں دفتر پڑھے لفظ بہ لفظ دل لگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے بے استعدادی، قوت مطالعہ کی کمی، اور علوم عقلیہ و آلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر عناں گیر رہی، لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ع

آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

اس عرصہ کے بعد حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت مجدد اور حضرت مخدوم بہاری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے آگیا، وحی و نبوت کی قطعیت، مقام نبوت و منصب رسالت کی بلندی و برتری اور خصائص نبوت و انبیاء اور نبوت و ولایت کے لوازم و مابہ الامتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، ان پر دقت فکر کے لحاظ سے یونان و عجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان، اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء کے دواوین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار نثار، مکتوبات مجددی کے تذکرہ کے آخر میں سنت و بدعت کے بارے میں جو مجددانہ کلمات و تحقیقات قلم سے نکلی ہیں ان سے بڑا شرح صدر اور یقین کا اضافہ ہوا، نیز دور اکبری و جہانگیری میں دین کی نصرت و حمایت کے سلسلہ کے مکتوبات نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا۔ اور افسردہ قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی، انسانی تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ گذر چکا ہے، کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات کے مکتوبات میں پائی جن پر صدیاں گذر چکیں، مگر وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو عموماً لکھنے کے وقت ہوتی ہے۔

میرے محترم دوست اور دینی کاموں میں رفیق کار مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے "الفرقان" کا شاہ ولی اللہ نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو اس بے بضاعت سے بھی فرمائش کی کہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہ

بہ حیثیت مصنف کا عنوان اپنے لئے منتخب کیا، اس کے لئے ضروری تھا۔ کہ شاہ صاحب کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے، کچھ پہلے دیکھی تھیں کچھ نہیں دیکھی تھیں، اس سلسلہ میں "ازالۃ الخفاء" کے بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی، یہ دینی نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا، انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہونگا، جتنا مکتوبات اور "ازالۃ الخفاء" سے علم کا چشمہ ابلتا نظر آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ اور دوسرے سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے

آجاتا ہے، آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت کے خصائص، نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ علمی پختگی کے ساتھ کیا لطف و لطافت میں ادب و شاعری سے کم ہے۔؟

حجۃ اللہ البالغہ میں نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے تلمیذ رشید اور پنجاب کے مشہور عالم و مصلح حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے پڑھی تھی، اور دماغ پر اسکی عقلیت، محکم استدلال، اور شاہ صاحب کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا، حجۃ اللہ البالغہ سے علمی و اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی، اور اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اسکی تحقیقات سے اتنا متحقق نہیں، جتنا شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی کتابوں سے، اگر اپنے فکر و مسلک کے لئے کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے، تو میں انہیں کا نام لے سکتا ہوں، اور درحقیقت ہمارا تعلیمی و فکری نسب و شجرہ انہیں پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نامور پوتا شاہ محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے، لیکن ان کی شہرۂ آفاق اور مسلّم ذکاوت اور وفور علم کا اندازہ صرف "منصب امامت" سے ہوا، جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مختصر تصنیف "العون الکبیر فی اصول التفسیر" (جس کو میں شاہ صاحب کی قلمی بیاض کہتا ہوں۔) کے بعض علمی اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید کے مطالعہ و تفسیر میں بڑی رہنمائی کی، اور شاہ صاحب کے بعض مختصر جملوں، اور تھوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے، اور مطالعہ قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات کے مجموعہ "صراط مستقیم" (مرتبہ مولانا اسماعیل شہیدؒ مولانا عبد الحیؒ) کو بہت دیر میں دیکھا، مگر تصوف کے اچھے ذخیرے اور ائمہ تصوف کے ملفوظات خصوصاً حضرات چشت کے پورے سلسلۂ ملفوظات کے مطالعہ کے بعد دیکھا، اور معلوم ہوا کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی کتاب ہے، سلوک راہ نبوت، اور تقرب بالفرائض کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحب امام تھے، اور جو اس عصر کے لئے تزکیۂ نفس، اور قرب الی اللہ کی سب سے آسان، بے خطر اور وسیع شاہراہ ہے، طریقت و حقیقت اور سلوک و تربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، وہ خداداد ذکاوت، علوم نبوت سے فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت، اور دقت نظر

کی دلیل ہے، اہل ظاہر و باطن اور اہل معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا ہے، اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں، وہ ان کی اعلیٰ سلامت طبع، دماغی توازن و اعتدال، اور میانہ روی کی شاہد ہیں، کاش! اس کتاب کی شایانِ شان خدمت ہوتی، اور نئے طرز پہ مرتب کر کے پیش کی جاتی ——

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی اور صناعی علوم، اور تصنیفات سے پیدا ہو جاتی ہے، دور ہوئی، اس کی بڑی بھلی تمیز پیدا ہوئی، کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم و حقائق ادا کئے جا سکتے ہیں، اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں، جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کئے جا سکتے، ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو اور چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو اور حواشی نہ ہوں ——

اس عصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ (م ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء) سے ملا، تو ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبتہً سہولت ہوئی، حسن الفاظ اور حسن ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی، میں نے ایک موقعہ پہ عرض کیا، کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات نہ لکھے ہوتے، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی، مولانا نے اسکو پسند فرمایا، اور دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحب کے مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے درسی و متداول، اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں، بعض لفظ بہ لفظ دیکھیں، لیکن اصل فائدہ متن قرآن کے سادہ اور بار بار کے پڑھنے سے ہوا، اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے، کہ قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی و لسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علوم نبوت و مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت و زندگی کان خلقہ القرآن کا پرتو ہو، اور جنہوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علیؓ کا مقولہ) کہنے والے کی قلبی و ذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو ان حضرات کے علوم کی تازگی و شگفتگی، بے آمیزی اور نکھار اور علم کی وسعت و گہرائی سے قرآن مجید کے الفاظ کی وسعت و عمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے کئی الفاظ جو "لسان العرب" اور مفردات غریب القرآن سے اور کئی آیات جو زمخشری کی ادبی تفسیر کشاف امام رازی کی عقلی تفسیر "فتوح الغیب" اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں، الفاظ و معانی میں نئی وسعت

اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ہیں ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں، ان کا احساس ہوتا ہے، قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دیئے ہیں، کان وہی آوازیں سنتے ہیں، اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں، جو اشکالات اور شبہات علم کلام کی کتابوں نے، اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دیئے ہیں، وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں، قرآن مجید کے سمجھنے کے یہ دو مطلبی طریقے ہیں۔

سنا ہے کہ جب قرآن مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے، تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے لگتا ہے، انسانی کتابیں، انسانی تحریریں انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں، ادباء اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں، جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی، سفید کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقش و نگار کاغذی پھول معلوم ہوتے ہیں، جن میں رنگ ہے خوشبو نہیں، انسان کا علم اتھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے، ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے، تسکین صرف وحی و نبوت کے راستہ سے آتے ہوئے علم سے ہوتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہنچایا، اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

دادیم ترا از منزل مقصود نشاں
گر ما نہ رسیدیم شاید تو رسی

ماہنامہ الحق پر ایک تازہ تبصرہ

اکوڑہ خٹک ضلع پشاور کی مشہور و معروف دینی درس گاہ "دارالعلوم حقانیہ" جناب شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کے زیر اہتمام جو اس کے بانی و مہتمم ہیں، دریائے اٹک کے پار کے تمام علاقوں میں دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں وہی خدمات سرانجام دے رہی ہے جو ایک عرصہ دراز تک برعظیم میں دارالعلوم دیوبند دیتا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اطراف میں قیام پاکستان کے بعد یہ درس گاہ صحیح معنوں میں دارالعلوم دیوبند کی جانشین ثابت ہوئی ہے۔

ماہنامہ الحق اس درسگاہ کا ترجمان ہے۔ اس کے مدیر سمیع الحق صاحب اس قدر شستہ و شگفتہ اردو زبان لکھتے ہیں اور اس ماہنامہ کو اتنی عمدگی اور سلیقہ سے مرتب کرتے ہیں کہ الحق ملک کے چوٹی کے دینی رسالوں میں شمار کیا جا سکتا ہے پیش نظر شمارے میں دینی و سیاسی دونوں انواع کے مضامین ہیں اور نہایت اعلیٰ معیار کے ہیں۔

(امروز - لاہور - ۲۶ فروری ۱۹۷۲ء)